ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

زاہدہ حنا کے افسانوں میں بین الاقوامی سیاسی موضوعات اور عصری شعور

INTERNATIONAL POLITICAL THEMES AND CONTEMPORARY CONSCIOUSNESS IN ZAHIDA HINA'S SHORT STORIES

1۔ڈاکٹر پروین کلو

ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

2۔ارباب خان

ریسرچ سکالر پی ایچ ڈی شعبہ اردو ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

3۔ ڈاکٹر محمد رحمان

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

ABSTRACT:

When any literature is created, it contains the reflection of social and political activities of its time. A writer and poet knows the pulse of the society and the owner of the most sensitive heart. Literature reflects the truth of his era and if there is a political and social deterioration in the era of a writer, it also shines in his literature. This is the reason that if there is a political attraction in the age of a writer, then his image is also included in his writings, poems and ghazals. If we talk about the beginning of Urdu literature, then its beginning was due to political corruption. The period when Auliya Allah was engaged in strengthening the roots of Urdu literature. At that time, India was suffering from severe political and international conflict. Various sultans and nobles were establishing their own estates and forming the government. Due to the establishment of different kingdoms and movement of poets and writers, many new words were added to the prose and poetic capital of Urdu literature, which gave Urdu and literature a wide vocabulary.

Key Words:

Zahid Hina, International Political Themes, Contemporary Consciousness, Social and Political activities, Urdu Literature, India, wide vocabulary

بیسویں صدی ہندوستان میں سیاسی بحران لیے داخل ہوئی جس نے نہ صرف ملکی حالات کو اثر انداز کیا بلکہ مختلف اصناف اَدب کو بھی جنم دیا تھا۔ ہندوستان کی سیاسی بیداری اور تحریک آزادی میں اُردو لکھنے والوں نے ایک بنیادی کردار ادا کیا۔ تحریک آزادی میں سب سے زیادہ اہم کردار ترقی پسند تحریک (1936ء) نے ادا کی جس کے زیرِ اثر لکھنے والوں نے پہلی بار انگارے (1932ء) میں کھل کر معاشرتی بغاوت کی راہ ہموار کی۔ پہلی جنگِ عظیم نہ صرف ملکی بلکہ عالمی سیاسی حالات کو بھی متاثر کیا تھا۔ اس دور میں افسانے نے ملکی حالات اور سیاسی موضوعات پر اپنا زورِ قلم صرف کیا۔ ملکی سیاسی حالات سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں اہم نام پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور سعادت حسن منٹو شامل ہیں۔ شاعری میں جو اہم نام ملکی سیاسی حالات میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور ناصر کاظمی کے ہیں۔ ان شعرا میں فیض احمد فیض خاص طور پر اہم ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں سیاسی، سماجی اور معاشرتی عوامل کی منہ بولتی تصویر ہیں جیسے ان کی نظم "صبح آزادی" اگست 1947ء کے سیاسی حالات کی نمائندگی کرتی ہے۔ فیض احمد فیض کو ملکی حالات سے شدید مایوس ہوئی۔ وہ یہ نظم تخلیق کرتے ہیں جس سے اُس دور کی سیاسی اور جاگیرانہ سوچ کی عکاسی بھی ہوتی ہے:

؎ یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی منزل کہیں نہ کہیں (1)

اگر ہم انقلاب 1857ء کی بات کریں تو اُس دور کو شدید ابتری کا دور کہا جائے گا۔ جب برطانوی سامراج کی ملک گیری کی ہوس نے تمام ہندوستان کو شدید سیاسی کش مکش میں مبتلا کیا تھا۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور انگریز پورے ملک پر مسلط ہو چکے تھے۔ جو کوئی بھی انگریز سامراج کے خلاف آواز بلند کرتا اُس کو گولی سے اُڑا دیا جاتا۔ مرزا غالب جیسے عظیم شاعر جنھوں نے ان حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ بھی کھل کر انگریز سامراج کے خلاف نہ لکھ سکے کہ کہیں ان کا انجام بھی مولوی محمد باقر، امام بخش صہبائی اور مولانا فضل حق خیر آبادی جیسا ہو۔

انگریز سامراج نے پورے ملک کو جنگی چھاؤنی میں بدل رکھا تھا اور اپنی سامراجیت کی ہوس میں کسی کو سر اُٹھانے کی اجازت نہ دیتے۔ انگریز سامراجیت کے خلاف جو پہلی بار نفرت نظر آئی وہ اکبر آلہ آبادی کی نظموں میں نظر آئی۔ اکبر آلہ آبادی کے یہاں جو طنز ملتا ہے وہ برطانوی سامراج کی دہشت گردی، مذہبی جبر کے خلاف ایک مخصوص طرز کا احتجاج تھا۔

نظیر اکبر آبادی کے بعد اگر کسی نے کھل کر انگریز سامراج کے خلاف لکھا تو وہ "انگارے" تھا۔ انگارے کی اس بغاوت کو انگریز سرکار نے بھانپ لیا اور انگارے پر پابندی زبان بندی کے لیے کی گئی لیکن اس کی وجہ سے "انگارے" کو وہ شہرت ملی جس کی مثال اُردو ادب میں کم ملتی ہے۔ انگارے کی تحریروں کے حوالہ سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> "اُنھوں نے ماحول کے نئے تقاضوں کے مطابق ادیب کی آزادی کا حق طلب کیا۔ ادب اور زندگی کے مقاصد کا تعین کیا اور اَدب کو زندگی اور ماحول کا ترجمان قرار دیا۔"(2)

اگر "انگارے" کے مرکزی خیال پر غور کیا جائے تو اس میں زیادہ تر افسانے مذہبی ریاکاری، منافقت اور سماج میں عورتوں کی ناگفتہ حالت کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ ان لکھنے والوں میں سجاد ظہیر جن کے پانچ افسانے اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان کا لہجہ شدید تر تھا۔ "انگارے" کی اشاعت کے ساتھ ہی پورے ہندوستان سے اس کے خلاف احتجاج بلند ہوا اور اسے فحش، مذہبی جذبات کے خلاف، اخلاقیات کے خلاف گھناؤنی سازش قرار دیا گیا۔ اس قدر احتجاج کی بنا پر آخر کار "انگارے" 1933ء میں بند کر دیا گیا اور اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ انگارے اپنے دور کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا جس نے روایت سے انحراف کیا اور روایت شکن کہلایا۔

"انگارے" کی تحریر کو انگریز سرکار نے مارکسی شعور کی ایک جھلک جانا اور پابندی عائد کر دی۔ انگارے کی اشاعت ان مذہبی روایات سے بھی بغاوت تھی جو صدیوں سے بغیر کسی دلیل کے سچ مانے جاتے تھے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو انگارے نے ملکی، مذہبی اور روایات سے بغاوت اختیار کی اور سیاسی و مذہبی رسومات کے خلاف کھل کر لکھا۔

جنگِ آزادی 1947ء جس نے ہندوستان کو ایک نیا سیاسی موڑ عطا کیا اور لاکھوں کی تعداد میں انسانی جانوں کا ضیاع ہوا، جس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو آزادی تو ملی لیکن صرف ذہنی آزادی۔ آج ذہنی طور پر ہم انگریزوں کی سیاسی چالوں کا شکار ہیں اور اپنے مقاصد کا حصول چاہتا ہے تو کبھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا جھوٹا واقعہ بنا کر وہ مسلمانوں پر چڑ دوڑتا ہے اور ہم ذہنی اور معاشی پابندیوں میں جکڑے اُس کی حمایت کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ 11 ستمبر 2001ء کو امریکا میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا ہے۔ جس نے پوری دُنیا پر اپنے دور س اثرات چھوڑے ہیں۔ اس واقعے کے اثرات ساری دنیا کے ساتھ ساتھ اُردو اَدب پر بھی پڑے ہیں۔ اُردو اَدب ویسے بھی بڑی حد تک سیاسی و معاشرتی مسائل کی عکاسی کرتا رہا ہے۔ اس لیے اس واقعہ کے حوالے سے بھی بہت سے ادیبوں نے لکھا جن میں حسن منظر کے ناولوں "ماں بیٹی"، مرزا اطہر بیگ کا "غلام باغ"، مستنصر حسین تارڑ کا "قلعہ جنگی" اور "خس و خاشاک زمانہ" اس کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کی افسانہ نویس زاہدہ حنا کا افسانہ "تنہائی کے مکان میں" بھی امریکا کی اجارہ داری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

معاشرتی جبر و استحصال دراصل متعدد طبقات یا صاحبِ اختیار کی طرف سے طاقت اور سیاسی برتری کا بے جا استعمال ہوتا ہے جو وہ محکوم قوموں پر کرتا ہے۔ انگریزوں نے برصغیر کو ذہنی آزادی دی پر آج بھی وہ اپنی مختلف سیاسی چالوں کی بدولت تیسری دنیا کے لوگوں کو غلام بنائے ہوئے ہے اور مختلف ادیب و شاعر آج کی عوام کو اس ذہنی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ساری بحث کا مقصد صرف عالمی، سیاسی برتری کو واضح کرنا تھا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ سیاست کہاں سے آیا اور اس کی مختلف تعریفات کیا ہیں۔

> "سیاست عربی زبان کا لفظ اور اسم مؤنث ہے۔ فرہنگ تلفظ میں سیاست کے معنی حکم رانی، حکمت عملی، ملکی امور، مصلحت اندیشی، حصول اقتدار اور تحفظ مفادات کے لیے جہد و جہد ہے۔"(3)

انسان کی جبلت میں شامل ہے کہ وہ اقتدار و قوت چاہتا ہے۔ سیاست ایک اجتماعی عمل ہے، جس کے اثرات معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق:

> "سیاست ایک لفظ ہے جس کے معنی پورے دور کی قدروں سے متعین ہوتے ہیں۔"(4)

انسانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو جیسے جیسے انسان کی عمر تبدیل ہوتی ہے ویسے ویسے سوچ کا پہلو بھی بدلتا جاتا ہے۔ انسان کی تبدیلی سوچ اس کو مختلف اقدامات اُٹھانے پر اُکساتی ہے۔ سیاست کا تعلق بھی اسی تبدیلی سوچ پر منحصر ہے۔ انسان اپنی قوتِ بازو میں اضافے کے لیے دوسروں سے مقابلہ کرتا ہے کبھی زیر ہوتا ہے کبھی زبر۔ اسی کش مکش کو سیاست کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ سیاست محض ایک فرد، گروہ، قبیلہ اور ملکی سطح تک نہیں ہوتی بل کہ بین الاقوامی سطح تک بھی جاتی ہے۔ مختلف ممالک اپنا زور بازو دکھانے کے لیے کم زور ممالک پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ موجودہ دور میں بھی امریکا کی جارحانہ پالیسیاں اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

"لفظ سیاست کے لغوی معنی ملک کی حفاظت و نگرانی، حکومت و سلطنت انتظامیہ ملک، بندوبست اور نظم و نسق کے ہیں۔"(5)

لفظی و اصطلاحی معنی سیاست کے جو بھی ہوں لیکن لفظ سیاست اَدبی تناظر میں لفظ پورے سماج کا استعارہ ہے۔

زاہدہ حنا باشعور فن کارہ ہیں۔ ان کو اپنے اردگرد کی پوری خبر ہے وہ نہ صرف قومی سیاسی واقعات سے کامل واقفیت رکھتی ہیں بلکہ بین الاقوامی سیاسی حالات سے بھی واقف ہیں اور انہوں نے ان سیاسی واقعات اور ان واقعات کے نتیجے میں برپا ہونے والی جنگوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ نیز جدید عہد میں سامراجیت کی جدید شکل اور سامراجیت کے عزائم کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جدید عہد میں نیلوفر اقبال اور زاہدہ حنا اس موضوع کی نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ نیلوفر اقبال کے افسانے "آپریشن مائیس" اور "سفید للیز" اس حوالے سے اہم ہیں۔ زاہدہ حنا کے کئی ایک افسانے یہی موضوع لیے ہوئے ہیں۔ زاہدہ حنا کا فن موضوع کو نبھاتے ہوئے کہیں بھی نعرے بازی میں داخل نہیں ہوتا۔ اس سیاسی موضوع اور سامراجیت کے سیاسی مادی اور معاشی زاویوں کو بیان کرتے ہوئے بھی ان کے اندر کی فن کار زندہ رہتی ہے۔

دنیا میں ہمیشہ سے دو طاقتیں موجود رہی ہیں ایک استحصال کرنے والی اور ایک جس کا استحصال ہو رہا ہو۔ پہلے پہل یہ چپقلش مزدور اور جاگیردار کے درمیان تھی بعد میں صنعتی عہد میں یہ مل مالک اور مزدور کے درمیان ہو گئی اور اب یہ ملکوں کے سطح پر پہنچ گئی ہے۔ پچھلے چالیس پچاس سالوں میں امریکہ اس حوالے سے پیش پیش ہے وہ جس ملک پہ چاہتا ہے جنگ مسلط کر دیتا ہے۔ اس کے جارہانہ عزائم اب پوری طرح کھل کے دنیا پہ ظاہر ہو رہے ہیں۔ حالیہ۔ افغان امریکہ جنگ اور افغان عراق جنگ اس حوالے سے خصوصی اہمیت رکھتی ہے زاہدہ حنا نے ان جنگوں کو بنیاد بنا کر اپنے فن کا حصہ بنایا اور حقیقت پسندانہ انداز میں امریکہ کے توسیع پسندانہ اور دہشت گردانہ عزائم کو کھل کر بیان کیا ہے۔

زاہدہ حنا جہاں نو تاریخیت کو بیان کرتی ہیں وہاں سماجی، نفسیاتی، مذہبی موضوعات کو پیش کرتی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں سیاست کو بھی نو تاریخیت کے زمرے میں پیش کیا۔ اگر ہم ماضی پر غور کریں تو اس دور میں بھی سیاسی سرگرمیاں ہمیں بڑی واضح نظر آتی ہیں۔ فرانسیسی و مغربی ادیبوں کی تحریروں میں جنگوں کے احوال و حالات بڑی وضاحت سے ملتے ہیں۔ جنگ عظیم اول و دوم اس سیاسی کش مکش کا پیشِ خیمہ تھیں۔ زاہدہ حنا اپنے افسانے **"آنکھوں کو رکھ کے طاق پر دیکھا کرے کوئی"** میں 1993ء میں "وائٹ ہاؤس (ہاؤس آف سوویٹس)" کی تاریخ کو بیان کرتی ہیں کہ کیسے ایک حکومت کو ختم کرنے کے لیے کسی بھی جان و مال کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ ایک ہی ملک سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ زاہدہ حنا تاریخ کے آئینے میں جھانکتے ہوئے موجودہ عہد کی ترجمانی کرتی ہیں کہ ہر دور میں ایسے حالات سامنے آتے ہیں۔ 1993ء میں "وائٹ ہاؤس" پر حملہ ہونے کی وجہ سے بہت سے بے قصور لوگوں کو مارا گیا۔ اسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں دیکھا جائے تو "لال مسجد" کا واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس دوران حکومت کے فیصلہ کی وجہ سے بہت سے اپنوں کو نیند کی گولی دی گئی۔

زاہدہ حنا اس حوالے سے لکھتی ہیں:

"تین اکتوبر کو ایک اور خونیں اتوار ہماری تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ پارلیمنٹ میں پناہ لینے والوں پر کھانا اور پانی بند، بجلی کٹ چکی۔ اس کی کھڑکیوں میں شمعیں جھلملاتی ہیں۔"(6)

"معدوم ابنِ معدوم" میں فرضی کرداروں کے ذریعے پاکستان اور بھارت کی تاریخ کو بیان کیا۔ اس افسانے میں تقسیم کے بعد کی تاریخ بیان کی گئی ہے کہ جب بھی پاکستان اور بھارت کے سیاسی حالات خراب ہوتے ہیں تو ذرائع آمد و رفت بند کر دیے جاتے ہیں:

"ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خط و کتابت بند تھی، فون نہیں ہو سکتا تھا، سفر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پوتے کی پیدائش کی خبر لندن سے آئی تو وہ ہونٹوں سے ہنستی اور آنکھوں سے روتی تھیں۔"(7)

"رقصِ مقابر" میں زاہدہ حنا نے افغانستان کی سیاسی صورتِ حال کو بیان کیا ہے کہ کس طرح مسلمان نے اپنے مسلمان بھائیوں کو قتل کیا صرف اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے۔ 18-اپریل 1992ء کو مجاہدین کے گروہ نے ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور نرل نجیب کو پھانسی دی گئی اور مجاہدین نے اپنوں کا خون کرنے کے بعد افغانستان پر قبضہ کر لیا۔ امریکہ کی سازش کی وجہ سے مسلمان مسلمانوں کا خون بہانا شروع ہو گیے۔ امریکہ نے افغانستان میں مجاہدین کو مدد فراہم کی تا کہ وہ روسی فوج کے خلاف جنگ کا علان کر دیں۔ جب روس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو امریکہ کو ان مجاہدین کی ضرورت نہ رہی اور پھر ان مجاہدین کو امریکہ نے دہشت گرد قرار دیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے اپنوں کا خون کر کے اقتدار حاصل کیا۔ بقول زاہدہ حنا:

"ان گستاخوں کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے انہیں پل چرخی کے زندان میں بند کیا جائے۔ ہم کفار کو تہس نہس کرنے آئے ہیں اور ہمیں اسلحہ چاہیے خواہ وہ افرنگی ہو یا امریکی۔"(8)

زاہدہ حنا اس افسانے میں افغان جنگ کا احوال بیان کرتی ہیں۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ افغان عوام اور افغان طالبان میں سے کون حق پر ہے۔ طالبان خود کو اسلام کا علم بردار کہتے ہیں اور جس عوام کا وہ استحصال کر رہے ہیں، وہ بھی مسلمان ہیں۔ مرنے والا بھی مسلم اور مارنے والا بھی مسلم تو جنگ کی وجہ کیا ہے؟:

”دس درویش ایک کمبل میں سو سکتے ہیں۔لیکن دو بادشاہ ایک مملکت میں سانس نہیں لے سکتے تو یہ کیسے دوریش اپنے سوا کوئی دوسرا گوارا نہیں۔“(9)

”کم کم بہت آرام سے “ میں زاہدہ حنا نے کابل میں ہونے والی امریکی جنگ کو نو تاریخیت کے ذریعے بیان کیا ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ وہ چنگیز خان کے دور کی تاریخ کو کابل کی تاریخ سے ملاتی ہیں۔جب چنگیز خان نے اپنے پوتے کو بامیاں فتح کرنے کے لیے بھیجا تو اس دوران اس کے پوتے کو قتل کر دیا گیا۔جس کی وجہ سے چنگیز خان کو بہت بڑا صدمہ پہنچا۔سو اس نے اپنے پوتے کا انتقام لیا۔اپنے افسانے میں زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

”چہیتے پوتے کی موت چنگیز خان کے لیے اتنا بڑا صدمہ تھی کہ اس نے بامیاں کی وادی میں کسی ایک جان دار کو جیتا نہ چھوڑنے کی سوگند کھائی، سو کوئی مرد، عورت، بچہ، بوڑھا، جیتا نہ چھوڑا گیا۔“(10)

اسی طرح زاہدہ حنا نے چنگیز خان کی تاریخ کو کابل کی تاریخ سے ملا کر پیش کیا۔کابل میں بھی کلسٹر بم کے ذریعے سے وہاں کے بچوں، عورتوں اور مردوں کو نشانہ بنایا گیا۔انگریزوں کو اس ملک سے نکال دیا گیا تھا، تو یہ دوبارہ کس طرح ملک میں داخل ہو گے تھے۔زاہدہ حنا قاری کو ماضی سے مستقبل کی طرف لے کر جاتی ہیں کہ چنگیز خان تو زندہ کو لہو پلوا کر آگے بڑھ گیا تھا۔مگر آج اس طرح نہیں ہو تا وہ لکھتی ہیں:

”آج کے چنگیز کہیں نہیں جاتے وہ ڈریکولا کی طرح قوموں کی گردن میں اپنے دانت اتار دیتے ہیں۔“(11)

زاہدہ حنا **”ہوا پھر حکم صادر “** میں بنگالیوں اور پاکستانیوں کے بٹوارے میں بیان کرتی ہیں کہ کس طرح ہم مسلمان ایک دوسرے ملک کی سازشوں میں آکر آپس میں لڑائی شروع کر دیتے ہیں۔حالاں کہ دوسروں کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو مسلمانوں سے الگ رکھیں، سو وہ اس مقصد میں کام یاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف اس قدر نفرت بھر دی گئی کہ ہم ایک ملک ہوتے ہوئے بھی الگ ہونا چاہتے تھے۔

اس حوالے سے زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

”دماغ خراب ہوا ہے تمہارا؟ یہ کالے ٹھگنے ہم پر حکومت کریں گے ؟ ہم ان مردود بنگالیوں کے لیے احتجاج کریں گے ؟ جلوس نکالیں گے ؟“(12)

زاہدہ حنا آج کے دور سے موازنہ کرتی ہیں تو کہتی ہیں کہ آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہر کوئی حکم ران بننا چاہتا ہے۔کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔جس طرح پاکستان اور بنگال کے درمیان ہوا۔بھارت کی سازش کی وجہ سے بنگلہ دیش نے ایک الگ ملک کی حیثیت اختیار کر لی۔

”زیتون کی شاخ“ ”ایڈگر“ کے کردار کے ذریعے سے سیاسی نقطہ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔”ایڈگر“ جو اس افسانے کا ایک اہم کردار ہے، جس کو جبری طور پر ویت نام کی جنگ میں بھرتی کر لیا جاتا ہے۔اس کا باپ بھی کوریا کی جنگ میں کام آیا۔ایڈگر ماں کی اکلوتی اُولاد ہے جس کو جبری طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کو ایک ایسی جنگ پر بھیجا جاتا ہے جو اس کی اپنی جنگ نہیں ہوتی۔

اس حوالے سے زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

”ان میں سے کچھ میرین یونی فارم اور بعض امریکن آرمی کی وردی پہنے ہوئے تھے۔یہ سب لڑکے جن کی ابھی کھیلنے کی عمریں تھیں، اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ایک ایسی جنگ لڑنے جا رہے تھے، جو ان کی اپنی جنگ نہ تھی۔“(13)

”زیتون کی شاخ“ ایک سیاسی تناظر میں لکھا جانے والا کام یاب افسانہ ہے۔اس افسانے میں امریکا کی سامراجیت کھل کر عیاں ہوتی ہے۔امریکی شہری جن کو زبردستی نیٹو افواج میں بھرتی کیا جاتا ہے بغیر ان کی رضامندی کے اس افسانے میں ان فوجیوں کی نفسیاتی سوچ کی مکمل عکاسی ہوتی ہے جو امریکی جارحانہ پالیسیوں کی مخالفت کرتے ہیں۔اکثر زاہدہ حنا ایسے خیالات کو اُجاگر کرتی ہیں کہ قاری محو حیرت رہ جاتا ہے۔اس حوالے سے زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

”وہ کس قدر بدنصیب عورت تھیں، اس کا شوہر جنگ کی بھینٹ چڑھا تھا اور اب اس کا بیٹا جنگ کے جہنم زار میں اُترنے والا ہے۔“(14)

”رنگ تمام خون شدہ“ ایک ایسا افسانہ جس میں حکم رانوں کا ذکر ملتا ہے کہ جب وہ کسی عہد میں حکم ران بن جاتے ہیں تو غریب عوام کا استحصال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔وہ اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے اور عوام بھی ان کو ہر بات میں سر جھکائے ہوئے ہوتی ہیں۔

بقول زاہدہ حنا:

”درباریوں کے سر جھکے ہوئے تھے اور شہنشاہ کے سامنے زمین پر ایک کیڑا رینگ رہا تھا۔“(15)

حرف و سخن
HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.1 2024

زاہدہ حنا اس افسانے میں طبقاتی فرق کو بیان کرتی ہیں کہ وہ کس طرح لوگوں پر ظلم و جبر کرتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے اہم اپنا وجود ہے باقی سب ایک حقیر چیز کی مانند ہیں۔ ان کے نزدیک اعلیٰ حکم ران اپنے اُصول دوسروں سے مختلف بناتے ہیں اور اپنے سے کم حیثیت لوگوں کے اُصول مختلف ہوتے ہیں۔ وہ جب سیاست میں قدم رکھتے ہیں، تو عوام سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کا کام کرتے ہیں۔ جب ووٹ حاصل ہو جاتی ہے تو پھر ان کے بات کرنے کا طریقہ بھی بدل جاتا ہے۔ زاہدہ حنا اپنے افسانے میں یہ بات سامنے لاتی ہیں کہ حکم ران کے نام تو بدلتے رہتے ہیں، مگر حکم رانوں کے بنائے گئے اُصول ویسے ہی ہوتے ہیں۔

اس حوالے سے زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> ”اسے بے اختیار ہنسی آگئی، شاہوں کے حکم رانوں کے آئین ابتدا سے اب تک ایک ہی تھے۔ عہد بہ عہد ان کے القابات بدل جاتے تھے، ان کا طریقہ حکم رانی بدل جاتا تھا لیکن وہ ہمیشہ ظل اللہ تھے۔ مامور من اللہ تھے۔“(16)

”بود و نبود کا آشوب“ میں وہ حکم رانوں کے آگے سر اُٹھانے والوں کے ساتھ جو ردِ عمل برتا جاتا ہے۔ اس کو بیان کرتی ہیں کہ کس طرح ان کو طرح طرح کی سزائیں دی جاتی ہیں اور اس وقت تک سزا دی جاتی ہے جب تک کہ وہ اس دُنیا سے چلے نہ جائیں۔ ان کی سزائیں اس وجہ سے دی گئی کہ وہ حکم رانوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ حکم ران بھی فیصلہ کرتے ہوئے یہ سوچتے ہیں کہ زمین میں صرف وہی خدا کے نائب ہیں اور خدا کے نائبین سے زیادہ بھلا اور کوئی عدل نہیں کر سکتا۔

اس حوالے سے زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> ”وہ ہنس رہے تھے ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ اُنھوں نے کس کس طرح کی اذیتیں دیں، اس کی انگلیوں سے ناخن کس طرح کھینچے گئے، اسے کتنے گھنٹے برف کی سل پر لٹایا گیا اور کتنی مرتبہ بجلی کے جھٹکے دیئے گئے۔“(17)

”بود و نبود کا آشوب“ میں قلم کار نے کچھ تاریخی حوالوں کی مدد سے ماضی کے دل دہلا دینے والے واقعات بیان کیے ہیں۔ زاہدہ سقراط کے زمانے کا احوال بیان کرتی ہیں کہ کس طرح حق اور سچ بولنے کی پداش میں اُسے زہر کا پیالہ پینا پڑتا ہے۔ آج کے دور میں حالات کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ سقراط کو زہر پلایا جاتا ہے، لیکن آج زہر کی جگہ گولی نے لے لی ہے۔ حق اور سچ بولنے والوں کو گولی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سیاسی مخالفت کو اُڑے لا کر گولیاں چل جاتی ہیں۔ آج بھی وہی لوگ کام یاب نظر آتے ہیں جو احباب اختیار کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ اس حوالے سے زاہدہ حنا لکھتی ہیں
:

> ”انگلیاں صرف ان ہاتھوں میں ہونی چاہیے جو اپنے آقاؤں کو سلامی دیتے ہیں یا ان ہاتھوں پر جو حکم رانوں کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ باقی تمام انگلیاں بیکار ہیں انہیں کٹ جانا چاہیے، انہیں کاٹ دیا جانا چاہیے۔“(18)

آج بھی کراچی شہر جسے روشنیوں کا شہر کہا جاتا ہے، سرِ شام ہی تاریخی میں ڈوب جاتا ہے۔ دہشت گردوں نے کراچی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ کراچی کی عوام ایک تو دہشت گری کا شکار ہوتی ہے، دوسرا محافظوں کے ہاتھوں بھی محفوظ نہیں۔ ”ہر سور قصِ بسمل بود“ کراچی شہر کے حالات کی عکاسی کرتا افسانہ ہے۔ راہ زنی، رشوت، بھتہ خوری اور اغوا جیسے واقعات نے اس شہر کا امن و سکون تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ دن دیہاڑے لوٹیرے سڑکوں پر دندناتے پھرتے ہیں۔ اغوا برائے تاوان کے واقعات نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اس حوالے سے زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> ”ہر تیسرے چوتھے روز ہڑتال اور ہڑتال کے نتیجے میں بارہ، اٹھارہ، بائیس لاشوں کا گرنا ایک معمول کی بات تھی۔ اخبار وحشت ناک خبروں اور خون آلود تصویروں سے بھرے ہوئے۔“(19)

ملکی ترقی کا انحصار جوان طبقے پر ہوتا ہے، لیکن ملکی سیاسی کش مکش سے سب سے زیادہ نقصان بھی نوجوانوں کو ہوتا ہے۔ جنگ اور امن ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ جنگی جنون قوموں کے ذہنوں کو صحیح سمت تعین کرنے سے روکتی ہے۔ جنگ انسانی ذہنوں کو کام یابی کے راستہ سے دور کرتی ہے۔ جنگ امن و سکون کی جگہ تعصب اور نفرت کو جنم دیتی ہے۔

اس حوالے سے ایک جاپانی مصنفہ ساکائے سوبوٹی لکھتی ہیں:

> ”معزز! بیوہ کچھ دیر وہیں کھڑی تمغے کو تکتی رہی۔ عزت کی یہ چھوٹی سی علامت ایک آدمی کی جان کا بدل تھی۔ اعزاز کے یہ تمغے بے شرمی کے ساتھ اپنی تعداد بڑھاتے اور ایک کے بعد ایک گھر کے دروازے کو آرائش دیتے جا رہے تھے۔ چھوٹے بچے ان کو سب سے بڑھ کر دل دادہ تھے۔“(20)

زاہدہ حنا اپنی تحریروں کے ذریعے سے انسان دوستی اور امن کا درس دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک جنگ انسانی زندگی کی تباہی ہے۔ ہمیں انسانی زندگی کی قدر کرنی چاہیے۔ زاہدہ حنا اپنے افسانوں میں تاریخ کو نو تاریخیت کے تناظر میں یہاں بیان کرتے ہوئے مختلف معاشرتی موضوعات کو رقم طراز کرتی ہیں۔ مصنفہ سیاسی، سماجی، معاشی، نفسیاتی، مذہبی اور تاریخی عوامل پر گہری نگاہ رکھتی ہیں اور انہیں

اپنے افسانوں میں موضوع بنا کر پیش کرتی ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف پاکستان کے حالات کو تاریخی حوالے سے پیش کیا بلکہ مختلف ممالک کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے حال کے ساتھ موازنہ کرتی ہیں۔

"کم کم بہت آرام سے ہے": یہ افسانہ بھی بین الاقوامی سیاست کے کھیل کا حصہ بننے والے ملک افغانستان کی کہانی ہے۔ اس میں سیاست سے لے کر غریب افغانیوں کے استحصال تک کا موضوع ہے کہانی بیانیہ تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار کم کم ہی اس افسانے کی راوی ہے کم کم ایک ڈاکٹر ہے اور افغان امریکہ جنگ کے دوران زخمی لوگوں کی مرہم پٹی کے لیے افغانستان بھیجی گئی ہے۔ وہ طویل خط لکھ کر اپنی دادی کو افغانستان کے حالات سے آگاہ کرتی ہے کہ کیوں کہ اس کی دادی ایک "رحمت پٹھان" جو کہ اس کی گود میں گری بادام اور کاجو کی تھیلی ڈال دیا کرتا تھا، کو یاد کرتی ہیں اور طالبان کو رحم دل سمجھتی ہے۔

کم کم ایک حساس طبیعت ڈاکٹر ہے جب وہ افغانستان کے بچوں کو محرومی کی دلدل میں جاتا دیکھتی ہے تب اسے اپنے کھانے پینے اور عیاشیاں یاد آتی ہیں۔ یہ افسانہ چوں کہ سارے کا سارا ایک خط ہی کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ تو کم کم اس بات پر اپنی دادی سے معذرت بھی کرتی ہے کہ اس نے اپنی دادی کی دیر بعد خط لکھا وہ وہاں سے اپنی مصروفیات کے بارے آگاہ کرتی ہے۔ آخر میں وہ کہتی ہے کہ باقی سب لوگوں کو بھی بتا دیا جائے کہ کم کم بہت خوش ہے۔

کم کم نے افغانستان میں رہتے ہوئے اس قوم کے اکھڑ مزاج اور چڑچڑے ہونے کی وجہ بھی دریافت کر لی تھی اس حوالے سے وہ اپنی دادی سے کہتی ہے:

> "دُنیا طالبان کو برا بھلا کہتی ہے، میں بھی یہاں آئی تو ان کے لیے میرے دل میں غصہ اور نفرت تھی لیکن یہاں رہ کر وہ میری سمجھ میں آگئے۔ (21)"

اس کہانی کے ساتھ ساتھ افغانستان کی تاریخ کا بھی ذکر ہے اور ان لوگوں کا بھی جو یہاں قبضہ کرنے آئے اور ہلاک کر دیے گئے اور موجودہ امریکی باسیوں پر بھی لکھاری کی گہری نظر ہے۔

اس افسانے میں زاہدہ حنا کا عصری شعور اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ امریکہ ابھی تک افغانستان سے پوری طرح نہیں نکلا۔ یہاں کتنے بچے بوڑھے اور جوان معذور ہو گئے ہیں۔ افسانے کا سارا منظر نامہ ہمیں موجودہ افغانستان کا نقشہ دکھاتا ہے وہی سیاسی اُتار چڑھاؤ، وہی رشتہ دوانیاں اور غیر ملکی قبضے کی کوشش۔

علی احمد فاطمی اس افسانے کے حوالے سے رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایک کہانی اور ایک خط، زندگی، خط کابل سے چل کر ہندوستان پہنچتا ہے۔ درمیان میں امریکا آتا ہے۔ مذہب آتا ہے اور فرقہ وریت بھی۔ انسان تو انسان، گڑیا گڑے بھی ہندو مسلمان ہو گئے اور پھر کابل کا حال۔۔۔ افغانستان کے رشتے تہذیبی حوالے اور پھر انسانیت کے معاملے جس طرح سے آتے ہیں۔ وہ زاہدہ کی تاریخی نگاہ اور تہذیبی شعور کی غمازی کرتے ہیں۔" (22)

مزید برآں اس میں کم کم نامی کردار نے جہاں افغانستان کے باسیوں کی حالت زار کا ذکر کیا ہے، وہاں اپنی نفسیاتی کش مکش کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس افسانے کا عنوان ہی قول محال کی مثال ہے کہ کچھ نہ ٹھیک ہونے کے باوجود وہ اپنے گھر والوں کو سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دے رہی ہے۔

"جاگے ہیں خواب میں": یہ افسانہ ایک کردار کے گرد گھومتا ہے۔ اسی کردار کے ذریعے ہی ہم ترکی، بغداد اور پورے عراق پر مسلط جنگ کے گھنے بادل دیکھتے ہیں۔

"لالہ" پیشے کے لحاظ سے صحافی ہے اور جنگ کی خبروں کو، کوریج دینے کے لیے بغداد بھیجی جاتی ہے۔ بغداد، ترکی اور دوسرے عرب ممالک کے حوالے سے جو اس نے رومانی کہانیاں سنی ہوتی ہیں۔ وہ سب کی سب ہوا ہو کر اُڑ جاتی ہیں۔

بغداد اور بعض دوسرے ممالک تو ویسے تھے ہی نہیں جیسے اس کے تصور میں تھے۔ بغداد سے رپوٹنگ کر کے جب "لالہ" واپس آتی ہے تب بھی اس ذہنی کیفیت میں رہتی ہے کہ جیسے گلیاں سنسان ہیں، بچے مر رہے ہیں۔ ایسے ہی ایک بار وہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ واپس گھر آ رہی تھی ان کی گاڑی جب دریا کا پل عبور کر رہی تھی۔ تو اس کو لگا کہ گولیاں چل رہی ہیں اور بچے تڑپ تڑپ کر دریا میں گر رہے ہیں۔ اس نے بھی گاڑی سے نکل کر دریا میں چھلانگ لگا دی اور ڈوب گئی اس کیفیت کو راوی یوں بیان کرتی ہے:

> "اس نے میم کو گاڑی سے نکل کر بھاگتے اور ریلنگ پر جھکتے ہوئے دیکھا، پھر وہ نگاہوں سے غائب ہو گئی۔ کشش لال کو تھرتھری چھوٹ گئی۔ وہ ریلنگ کی طرف لپکا۔ اس نے میم صاحب کو دریا میں ڈوبتے اُبھرتے دیکھا اور مدد کے لیے پکارنے لگا۔ کہیں کوئی نہیں تھا جو کسی کی مدد کو پہنچتا۔" (23)

یہ کہانی صرف "لالہ نامی" صحافی کے باطن کی کش مکش تک ہی محدود نہیں بلکہ بین الاقوامی سیاست اور نئے دور کی سامراجیت کے عناصر لیے ہوئے بھی ہے۔ بین الاقوامی سیاست کے حوالے سے دیکھا جائے تو امریکہ نے جو کچھ عراق امریکہ جنگ میں کیا وہ سب کے سامنے ہے وہ نیل پر قبضے کے لالچ میں عراق آگئے اور عراقیوں کی دولت لوٹ کر واپس چلے گئے اور ابھی تک وہ لوگ افغانستان میں ہیں اور اپنے سامراجی عزائم پورے کر رہے ہیں۔ ان کے اس روپ کے حوالے سے افسانہ نگار لکھتی ہیں:

"لیکن امریکی آسیب کچھ لوٹنے یا تباہ کرنے آئے تھے۔ دعویٰ کائنات کو سمجھنے کا خاندان یا شہر کے نہیں، دُنیا کے تو ویسے ان کے پر داداؤں اور سگڑ داداؤں نے جتنی دولت کمائی، اسے وہ آگ لگا دیتے تھے اور ساری دُنیا کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔"(24)

افسانہ نگار اس حوالے سے سارا قصور صرف امریکیوں کا نہیں کہتی۔ اس میں بہت کچھ قصور مسلمانوں کی لڑائی ہے۔ اس حوالے سے افسانہ نگار لکھتی ہیں:

"عیسائیوں کے مظاہرے ہو رہے تھے۔ لاکھوں کے مظاہرے، مسلم ہوتی تھی۔ اقبال کے سارے شعر تاریخ کے عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہو گئے تھے۔

علامہ صاحب کا جغرافیہ ذرا کم زور تھا ورنہ کاشغر کو اُمت مسلمہ کے کھاتے میں نہ ڈالتے۔۔۔"(25)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس افسانے میں معاصر منظر نامے کو بہت عمدگی سے فن کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس افسانے میں صحافی لڑکی کی حمایت کی وجہ سے وہ دماغی عارضے میں مبتلا ہو جانے کی کہانی الگ ہے اور بغداد اور عراق کے اُجڑنے کی کہانی الگ ہے۔ عراق کی حالت زار دیکھ کر "لالہ" نامہ صحافی لڑکی اپنی ذہنی کیفیت کی متوازن نہیں رکھ سکتی۔

"تنہائی کا چاہِ بابل": اس افسانے میں بھی بین الاقوامی سیاست کی ریشہ دوانیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ افسانہ بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار "سمیر" ہے۔ جو فلسفے کا اُستاد بننا چاہتا ہے مگر عربی کا اُستاد بن جاتا ہے۔ انگلینڈ وہ سکالر شپ پر پڑھنے جاتا ہے وہاں ٹرین میں پولیس والوں کے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے۔ کچھ دیر کے لیے وہ واہمے میں چلا جاتا ہے کہ پولیس والے ابنِ رشد مشہور فلسفی کو پکڑ لاتے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ مجھے گلیلو سے ملنے جانا تھا۔ مگر یہ لوگ ادھر آتے ہیں۔ وہ اس طرح کی اور بھی بہت ساری باتیں کرتا ہے۔ جب پھر وہ واہمے سے باہر آتا ہے تو کسی بوڑھی عورت کی گود میں پڑا ہوتا ہے اور وہ عورت پولیس والوں کو شکایت لگاتی ہے کہ یہ عربی میں کس سے بات کر رہا تھا۔ پولیس والے اس کو القاعدہ کا ایجنٹ سمجھ کر لے جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے "سمیر" کہتا ہے کہ میں یہودی ہوں اور پانچ زبانیں بول سکتا ہوں تو ان کا ردِ عمل کیا تھا۔ اس کیفیت کو افسانہ نگار نے یوں بیان کیا ہے:

"تم کتنی زبانیں جانتے ہو؟

عربی میری مادری زبان اور عبرانی مذہبی زبان ہے، فرنچ اور اسپینش میں نے سکول اور کالج میں پڑھیں۔ انگلش میں نے یہاں آنے کے لیے سیکھی۔ سمیر کے لہجے میں غرور تھا۔"(26)

بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو یہ افسانہ فکری اور فنی حوالے سے کامیاب افسانہ ہے۔

"تقدیر کے زندانی": اس افسانے میں جنگ کے دوران کام آنے والے ہندوستانیوں کی رُوداد ہے۔ جن کے پوتے وہاں کسی مشن پر جاتے ہیں، وہ دونوں صحافی ہیں۔ ایک کا نام "عرفان" ہے اور دوسرے کا نام "انتھونی"۔ "عرفان" کے اپنے مسائل ہیں اور "انتھونی" کے اپنے مسائل ہیں۔

"عرفان" کی دادی کو بتایا جاتا ہے کہ اس کے شوہر کی قبر بھی اُدھر ہی موجود ہے۔ وہ "عرفان" کو نصیحت کرتی ہے وہاں جائے تو اپنے دادا جی کی قبر پر بھی دُعا کرے اور ساتھ ہی ساتھ مغل سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے مزار پر بھی حاضری دے۔ واپس آتا ہے تو دادی کے سامنے جھوٹ بولتا ہے کہ اس نے دادا کے مزار پر بھی اور بہادر شاہ ظفر کے مزار پر بھی حاضری دی ہے۔ حالاں کہ کہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے دادا کو شاید دفن بھی نہ کیا ہو بلکہ ویسے ہی اس کی ہڈیاں کہیں گل سڑ گئی ہوں۔ نہ صرف "عرفان" کے دادا کے زمانے میں بلکہ "عرفان" کے اپنے زمانے میں بھی رنگون کی حالت کچھ زیادہ نہ بدلی تھی۔ اس حوالے سے افسانہ نگار لکھتی ہے:

"رنگون اسٹر پورٹ پر قدم رکھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ فضا میں خون کی اور خوف کی بُو ہے۔ کئی برس پہلے جب چھٹیاں گزارنے آیا تھا تو یہ عالم نہیں تھا لیکن اس مرتبہ ایئر پورٹ فوجی چھاؤنی لگ رہا تھا۔ الیگریٹین کاؤنٹر پر بھی اس کے اور انتھونی کے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھے گئے۔"(27)

اس افسانے کا مزاج بھی بہت کچھ پچھلے افسانے سے ملتا جلتا ہے۔ ہنگامہ آرائی اور فوجوں کی حکومت اور اس کے پیچھے امریکیوں کی سیاسی چال بازیاں اور ملکوں کو سیاسی حوالے سے عدم استحکام کا شکار کرنے کی کوششیں اس حوالے سے ہم زاہدہ حنا کو باشعور فن کارہ کہ سکتے ہیں کہ وہ مقامیت اور ملک کے اندرونی حالات سے زیادہ ملک کے بیرونی حالات کی خبر رکھتی ہیں اور پھر ان حالات و واقعات اور تاریخ کے مختلف ادوار کو اپنے افسانوں میں فن کارانہ طریقے سے پیش کرتی ہیں۔

"زیتون کی شاخ": اس افسانے کا محرک جنگ مخالف نظریہ ہے۔ اس نظریے کے حامی یہ کہتے ہیں کہ جنگ کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے اور جنگوں پر جو مالی نقصان ہوتا ہے اور جو پیسہ خرچ ہوتا ہے، اس کو انسان کے فوائد اور معاشرے میں مثبت تبدیلیوں کے لیے خرچ کیا جانا چاہیے۔ اس افسانے کی کہانی ویت نام کی جنگ میں شرکت کرنے والے امریکی فوجی نوجوان "ایڈگر" کے گرد گھومتی ہے۔ اس امریکی نوجوان کی ملاقات کراچی میں موجود امریکن قونصلیت میں ایک مقامی اسکرپٹ رائٹر لڑکی سے ہوتی ہے۔ دو تین ملاقاتوں میں ہی "ایڈگر" اس لڑکی کے قریب آجاتا ہے۔ اتفاق سے دونوں کے نظریات جنگ کے بارے ایک جیسے ہی ہیں۔ یعنی دونوں جنگ مخالف ہیں۔ دورانِ گفتگو ایک دن اس لڑکی پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ "ایڈگر" شام کی جنگ میں اپنی مرضی سے نہیں دباؤ کے تحت جارہا ہے۔ "ایڈگر" ویت نام کے لیے روانہ ہونے سے پہلے ایک شام A fare well to arms نامی فلم کے دو ٹکٹ لے آتا ہے۔ دونوں ایک ساتھ فلم دیکھتے ہیں۔ اس مختصر سی یک جائی نے لڑکی کے دل میں "ایڈگر" کے لیے نرم گوشہ پیدا کر دیا ہے۔ راوی لڑکی بہت زیادہ لبرل نہیں ہے۔ وہ پاکستانی ماحول سے پوری طرح باخبر ہے۔ درج ذیل پیراگراف سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے:

> "تم نے بلاوجہ فلم کی بکنگ کروالی ہے۔ اب مجھے اپنے گھر فون کرنا پڑے گا۔۔۔ میں نے کہا: ہاں تو فون کرو اور اپنے گھر والوں سے لمبی چھٹی لے لو۔۔۔
>
> اس نے کہا: تمہارا شاید دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ پاکستان ہے امریکہ نہیں کہ آدھی رات تک میں تمہارے ساتھ گھومتی رہوں۔ میں نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔" (28)

اس بات سے محسوس ہوتا ہے کہ لکھاری بہت زیادہ لبرل بھی نہیں ہے۔ نہ اس کے ملک کی تہذیب و ثقافت اس کو ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ تو پھر کس چیز نے اس لڑکی کو "ایڈگر" کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ "ایڈگر" کی جنگ مخالف سوچ نے اور جذبہ رحم نے۔ لڑکی کو "ایڈگر" پر رحم آتا ہے اور وہ "ایڈگر" سے ملنے کے بعد پہلی بار سوچتی ہے کہ:

> "پہلی بار میں نے سوچا کہ امریکی بھی انسان ہو سکتے ہیں۔" (29)

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اس افسانے میں جہاں ایک طرف امریکی انتظامیہ کی ذہنیت کو واضح کیا گیا ہے تو دوسری طرف ان لوگوں کی سوچ کو بھی پیش کیا گیا ہے جو دُنیا میں اس کے خواہاں ہیں اور جنگ کو ناپسند کرتے ہیں۔ "ایڈگر" ان لوگوں کا ہی نمائندہ ہے جو جنگ کی مخالفت کرتے ہیں۔ راوی خود بھی اس امن کی خواہاں ہے اور وہ پہلی پہلی ملاقات میں "ایڈگر" پر امریکیوں کے اس حوالے سے نفسیات پر طنز بھی کرتی ہے۔ خود راوی لڑکی کا کردار ان تمام لوگوں کا نمائندہ کردار ہے جو امریکیوں کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو امریکیوں کی دی ہوئی اقدار کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ یہی صورت حال ہماری سیاسی قیادت کا ہے۔ وہ دل سے امریکیوں اور اس کی پالیسیوں سے نفرت کرتے ہیں لیکن امریکیوں کی دی گئی امداد پر مصلحت اور خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔

حوالہ جات

1. فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1986ء، ص:47
2. ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، 1999ء، ص459
3. فرہنگ تلفظ، مرتبہ: شان الحق حقّی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، طبع سوم، 2008ء، ص:648
4. رشید امجد، ڈاکٹر، یافت و دریافت، مقبول اکیڈمی، لاہور، 1989ء، ص:92
5. فرہنگِ آصفیہ، مرتبہ: مولوی سید احمد دہلوی، جلد سوم و چہارم، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، طبع پنجم، 2006ء، ص:14
6. زاہدہ حنا، آنکھوں کو رکھ کے طاق میں دیکھا کرے کوئی، مشمولہ: رقص بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2017ء، ص:15
7. زاہدہ حنا، معدوم ابنِ معدوم، مشمولہ در رقص بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2017ء، ص:45
8. زاہدہ حنا، رقصِ مقابر، مشمولہ: رقص بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2017ء، ص:85
9. زاہدہ حنا، رقصِ مقابر، مشمولہ: رقص بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2017ء، ص:89
10. زاہدہ حنا، کم کم بہت آرام سے ہے، مشمولہ: رقص بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2017ء، ص:154

11. زاہدہ حنا،کم کم بہت آرام سے ہے، مشمولہ: رقص بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز،لاہور،2017ء،ص:158
12. زاہدہ حنا،ہوا پھر حکم صادر، مشمولہ: رقص بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز،لاہور،2017ء،ص:255
13. زاہدہ حنا،زیتون کی شاخ، مشمولہ: تتلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز،لاہور2017ء،ص:24
14. زاہدہ حنا،زیتون کی شاخ، مشمولہ: تتلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز،لاہور،2017ء،ص:32
15. زاہدہ حنا،رنگ تمام خون شدہ، مشمولہ: تتلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز،لاہور،2017ء،ص:159
16. زاہدہ حنا،رنگ تمام خون شدہ، مشمولہ: تتلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز،لاہور،2017ء،ص:165
17. زاہدہ حنا،بود نبود کا آشوب، مشمولہ: تتلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز،لاہور،2017ء،ص:136
18. زاہدہ حنا، جسم وزباں کی موت سے پہلے، مشمولہ: تتلیاں ڈھونڈنے والی، ص:234
19. زاہدہ حنا،ہر سو رقص بسمل بود، مشمولہ: رقص بسمل ہے،لاہور: الحمد پبلی کیشنز2017،ص:111
20. ساکائے سوبوئی، چوبیس آنکھیں،(مترجم)اجمل کمال، مشعل،لاہور،1995ء،ص:177
21. زاہدہ حنا،کم کم بہت آرام سے، مشمولہ رقص بسمل،لاہور: الحمد پبلی کیشنز،2017ء،ص:192
22. آسیہ نازلی،زاہدہ حنا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ،لاہور: الحمد پبلی کیشنز،2017ء،ص192
23. زاہدہ حنا، جاگے ہیں خواب میں، مشمولہ: رقص بسمل ہے،لاہور: الحمد پبلی کیشنز،2017ء،ص:184
24. ایضاً،ص:169
25. ایضاً،ص:171
26. زاہد حنا،تنہائی کا چاہ بابل، مشمولہ: رقص بسمل ہے،لاہور: الحمد پبلی کیشنز،2017ء،ص:201
27. زاہدہ حنا،تقدیر کا زندانی، مشمولہ رقص بسمل ہے،لاہور: الحمد پبلی کیشنز،2017ء،ص:222
28. زاہدہ حنا،زیتون کی شاخ، مشمولہ: تتلیاں ڈھونڈنے والی،لاہور: الحمد پبلی کیشنز،2017ء،ص:39
29. ایضاً